حالیہ بجٹ: عوام دوست یا معاشی بوجھ
ایک فکری جائزہ

مقررین: کاظم سعید۔ عارف حسن

اربن ریسورس سینٹر

ستمبر 2026ء

URC

F-144-70

ٹرانسکرپشن:

کشف ناصر

ادارت:

بلقیس، سیما لیاقت

عکاسی:

شکیل یونس

" حالیہ بجٹ: عوام دوست یا معاشی بوجھ۔۔۔ایک فکری جائزہ "
کے عنوان سے یہ فورم 18 جون 2026ء کو یوآرسی میں منعقد ہوا۔

یوآرسی رابطے کے لئے:

فون نمبر: 021-34387692

ای میل: urckhi@yahoo.com

ویب سائٹ: www.urckarachi.org

حالیہ بجٹ: عوام دوست یا معاشی بوجھ
ایک فکری جائزہ

مقررین:

کاظم سعید۔ ماہر معاشیات

عارف حسن ۔ چیئرمین یو آر سی

18 جون 2026ء

اربن ریسورس سینٹر

A-2 دوسری منزل ویسٹ لینڈ ٹریڈ سینٹر، کمرشل ایریا،
شہید ملت روڈ، کراچی، پاکستان

021-34387692
urckhi@yahoo.com
www.urckarachi.org
fb.com/urckhi
@urckhi

زاہد فاروق: اربن ریسورس سینٹر میں، میں آپ تمام افراد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کا یہ فورم بجٹ 2026-2027ء میں عام آدمی کے لیے کیا کوئی فائدہ موجود ہے یا نہیں؟ کے حوالے سے ہے۔اس اہم اور حساس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے ہمارے ساتھ ممتاز ماہرِ معاشیات جناب محمد کاظم سعید صاحب موجود ہیں۔کاظم صاحب ایوارڈ یافتہ کتاب" دو پاکستان" کے مصنف ہیں۔آپ ایک سینئر ڈیولپمنٹ پروفیشنل اور سی ای او پاکستان ایگری کلچر کولیشن (PAC) بھی ہیں، جبکہ گزشتہ 25 سال سے ورلڈ بینک سمیت متعدد ترقی پذیر ممالک میں انرجی پالیسی ایڈوائزر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے امریکہ سے تاریخ اور فلسفے میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کی ہے۔کاظم صاحب عام آدمی کے معاشی اور سماجی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں، اور آج کی گفتگو کے دوران بھی عام آدمی کی معیشت سے متعلق بنیادی مسائل تفصیل سے زیرِ بحث آئیں گے۔اس کے ساتھ ہی سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی انتہائی محترم ہستی جن کا شہری ترقی کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے، جناب عارف حسن صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ یہ اربن ریسورس سینٹر کی خوش قسمتی ہے کہ عارف حسن صاحب یوآرسی (URC) کے چیئرمین ہیں۔عارف حسن صاحب کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی معتبر اداروں کے ساتھ وابستگی رہی ہے اور آپ پاکستانی عوام، خصوصاً کم آمدنی والے طبقے کی ہمیشہ ایک مضبوط آواز بنتے آئے ہیں۔جبری بے دخلی کے معاملات ہوں، معیشت کے اثرات یا پھر پبلک ٹرانسپورٹ کے مسائل ہوں، عارف صاحب

اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعے ہمیشہ عام آدمی کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

اب میں محترم کاظم سعید صاحب کو دعوتِ فکر و سخن دیتا ہوں کہ وہ آج کے موضوع کے حوالے سے اپنی گفتگو کا باقاعدہ آغاز کریں۔

کاظم سعید: زاہد صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔ عارف حسن صاحب کے ساتھ اس پینل پر بیٹھنا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بطورِ انسان اور ایک پروفیشنل، انہوں نے جس طرح میری تربیت کی ہے۔ میں آپ لوگوں کو یہ بتانا چاہوں گا کہ میں نے ان سے جو سب سے بڑی چیز سیکھی، وہ یہ ہے کہ عام آدمی کے لیے کس طرح کام کیا جائے، حالانکہ ہمارے ملک کے اربابِ اختیار کسی کی کوئی بات نہیں سننا چاہتے۔ جب ہم کڑوا سچ بولتے ہیں تو اس میں تلخیاں بھی ہوتی ہیں اور حق بات کہنے کے لیے بہت بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے جس طرح کی ہمت میں نے عارف صاحب کے رویے اور کام میں دیکھی ہے یہ ایک ایسا ایکس فیکٹر (X-factor) ہے کہ جب ہم ترقیاتی کاموں یا سول سوسائٹی کے کردار کی بات کرتے ہیں تو بہت سے لوگ تکنیکی و پیشہ ورانہ پہلوؤں پر زیادہ غور کرتے ہیں اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں جو کہ ضروری بھی ہے لیکن سب سے ضروری عنصر ہمت ہے۔ اس کے لیے ایک وسعتِ تخیل کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس طرح اپنی بات مؤثر انداز میں آگے پہنچائی جائے۔ یہ خصوصیت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ رئیس امروہوی صاحب کا ایک شعر ہے، آپ تمام لوگ غور کیجیے گا، وہ کہتے ہیں کہ:

تیرِ ستم کی زد پہ سہی، یہ خوشی تو ہے
کیا کیا چبھے ہیں سینۂ اہلِ ستم پہ ہم!

عارف صاحب نے جس طرح اپنے وطن کے لوگوں سے محبت اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کی ہے، اس حوالے سے منیر نیازی صاحب کا ایک خوبصورت شعر یاد آتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

زندگی کے عذاب خانے میں
عاشقی کا وجود رحمت ہے!

وفاقی بجٹ کے ساتھ ساتھ صوبائی بجٹ بھی سامنے آگئے ہیں۔ اگر ہم صرف وفاقی بجٹ کے حوالے سے بات کریں گے، تو میں سمجھتا ہوں کہ عام آدمی سے متعلق اہم مضامین خصوصاً تعلیم اور صحت کے مسائل نظرانداز ہو جائیں گے کیونکہ اٹھارویں ترمیم کے بعد وفاقی بجٹ کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں رہا کہ وہ ان صوبائی اور بنیادی عوامی موضوعات پر براہِ راست اثر انداز ہو۔ اس لیے میں اپنی گفتگو کا کچھ حصہ پنجاب اور سندھ کے بجٹ کے حوالے سے بھی آپ کے سامنے رکھوں گا۔ وفاقی بجٹ کے حوالے سے ہمیں یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ وہ کون سے بنیادی معاشی مسائل ہیں جن کی وجہ سے ہم مسلسل مشکلات کا شکار ہیں۔

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ایک عوام دوست بجٹ سے متعلق ہماری کیا توقعات ہونی چاہئیں؟ میرے خیال میں ابتدائی طور پر اس سوال پر گفتگو کرنا اس لیے ضروری ہے، کیونکہ ہمارے ملک میں قومی سطح پر جس پیرائے میں معاشی گفت گو ہوتی ہے، وہ

بہت محدود ہو کر رہ جاتی ہے یعنی صرف یہ کہ کسی طرح حکومت کا اپنا جمع خرچ پورا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ تمام تر بحث وفاقی حکومت کے مالیاتی مسائل مثلاً پیسے کہاں سے آئیں گے؟ کتنے ارب روپے کے ٹیکسز کہاں سے وصول کیسے جائیں گے؟ اور بین الاقوامی قرضوں کی واپسی کے معاملات کیا ہوں گے؟ انہی چند تکنیکی موضوعات کے گرد سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس دوران بزنس کمیونٹی، ایکسپورٹرز اور تنخواہ دار طبقے کے علاوہ باقی عام لوگوں کی بات ہی نہیں کی جاتی، یا شاید ان کو اس معاشی نظام میں انسان بھی نہیں سمجھا جاتا۔

> جناب کاظم سعید کورنیل اور پرنسٹن یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ممتاز ماہر معاشیات، مصنف اور سینئر ڈیولپمنٹ پروفیشنل ہیں۔ وہ "پاکستان ایگریکلچرل کوالیشن" (PAC) کے بانی و سی ای او ہیں اور گزشتہ 25 سال سے ورلڈ بینک سمیت متعدد بین الاقوامی اداروں میں انرجی اور معاشی پالیسی مشیر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی ایوارڈ یافتہ کتاب" دو پاکستان: ہر پاکستانی گھرانے تک خوشحالی" ملکی معیشت کی پائیدار ترقی، زرعی اصلاحات اور امیر و غریب کے معاشی فرق کو ختم کرنے کا ایک واضح عملی راستہ دکھاتی ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں عام آدمی کے کمانے کی جو صلاحیت اور انسانی وسائل ہیں، ان پر سرمایہ کاری (Human Capital Investment) سب سے اہم چیز ہوتی ہے جبکہ ہمارے جیسے ملک میں بی جہاں اس سطح کی شدید غربت

موجود ہے، وہاں عوام پر سرمایہ کاری حکومت کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ کیا صوبائی بجٹس میں اس انسانی سرمایہ کاری کے حوالے سے کوئی عملی کام ہوا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ، اگر ایک شہری کے اندر صلاحتیں اور تعلیم سافٹ ویئر انجینئرنگ کی ہیں، جبکہ ملک میں نوکریاں صرف آٹا ملوں جیسی روایتی صنعتوں میں بڑھ رہی ہوں، تو ایسا ہنرمند شہری مایوس ہو کر بیرونِ ملک جانے (Brain Drain) کو ہی ترجیح دے گا۔ اس لیے بہترین اور جدید روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ہمیں ان کمپنیوں اور شعبوں کو سہولیات دینی ہوں گی جو باوقار نوکریاں مہیا کر سکیں۔ ان کمپنیوں کی ترقی کے لیے بنیادی انفراسٹرکچر بھی بے حد ضروری ہے۔

میری کوشش ہوگی کہ اس بجٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے گزشتہ 10 سے 15 سال کا معاشی پس منظر بھی آپ کے سامنے رکھوں۔ یہ تمام نکات اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن میکرو اکنامک (Macroeconomic) سطح پر پاکستان کو جو اس وقت سنگین مسائل درپیش ہیں۔ جیسے روپے کے مقابلے میں ڈالر کی قدر کیا ہے؟ حکومتی اخراجات کی کیا صورتحال ہے؟ اور ملک میں معاشی استحکام کا گراف کہاں کھڑا ہے؟ ایکسچینج ریٹ کا استحکام، شرحِ سود (Interest Rate) اور افراطِ زر (مہنگائی) جیسے مسائل عام لوگوں کے ساتھ ساتھ کاروبار چلانے والی کمپنیوں کے لیے بھی انتہائی ناگزیر ہیں۔

پچھلے دو سالوں کے دوران تنخواہ دار طبقے اور کمپنیوں پر ٹیکسز کا بوجھ بہت زیادہ بڑھا دیا گیا تھا، اور اسی عرصے میں مہنگائی بھی اپنی بلند ترین سطح پر تھی۔ حکومت کی جانب سے ان لوگوں پر زبردستی اضافی بوجھ ڈالا گیا جن پر پہلے ہی سے بوجھ تھا، ان پر مزید ٹیکس

نہیں لگانا چاہیے تھا۔ یہ بھاری بوجھ عوام اور کمپنیوں نے دو سال تک جیسے تیسے برداشت کیا، اور اب اگر حکومت بجٹ میں یہ کہہ رہی ہے کہ ہم نے اس بوجھ میں تھوڑی سی کمی کر دی ہے، تو یہ عوام پر کوئی احسان نہیں ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ سنگین معاشی غلطی اور ناانصافی پہلے کی ہی کیوں گئی تھی؟

اس کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ کم آمدنی والے طبقے یعنی جس شخص کی سالانہ آمدنی 6 لاکھ روپے تک ہے۔ اس پر لاگو ٹیکسز میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ دو لاکھ روپے ماہانہ سے زائد آمدنی والے تنخواہ دار طبقے پر ٹیکس کی شرح میں 10 سے 15 فیصد تک کچھ کمی ہوگی۔ مثلاً اگر کسی کی ماہانہ تنخواہ تین لاکھ روپے ہے (یعنی سالانہ 36 لاکھ روپے) تو موجودہ سال ان کو ساڑھے چار لاکھ روپے ٹیکس دینا تھا لیکن آئندہ سال انہیں چار لاکھ روپے ٹیکس کی ادائیگی کرنا ہوگی کیونکہ ان کا ٹیکس 10 سے 11 فیصد کم کر دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کی ماہانہ تنخواہ چھ لاکھ روپے ہے ان کا سالانہ ٹیکس 17 لاکھ سے کم ہو کر 15 لاکھ روپے ہو گیا ہے۔

ٹیلی ویژن پر اس رعایت کا بہت زیادہ ذکر کیا گیا ہے، لیکن اگر ہم اس کا حقیقی پس منظر دیکھیں تو ابھی حال ہی میں گھریلو معاشیات کا تازہ سروے جاری ہوا ہے۔ اس میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ اگر آپ پورے پاکستان کے تمام گھرانوں کو جو کہ تقریباً چار کروڑ ہیں اور ہر گھرانے میں اوسطاً چھ افراد ہوتے ہیں، جنہیں یکجا کیا جائے تو یہ تقریباً 24 سے 25 کروڑ کی کل آبادی بنتی ہے۔ اگر آپ ان تمام گھرانوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں کہ کون سا گھرانہ ماہانہ سب سے کم خرچ کرتا ہے اور کون سب سے زیادہ اور اس

فہرست کو پانچ مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو صرف 20 فیصد گھرانے ایسے نکلیں گے جن کی ماہانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہے جبکہ ملک کے 80 فیصد گھرانے ماہانہ ایک لاکھ روپے سے کم آمدنی میں اپنا گزارا کرتے ہیں۔ جبکہ حکومت کی جانب سے ٹیکسز میں جتنی بھی رعایت دی گئی ہے، وہ صرف انہی لوگوں کو دی گئی ہے جن کی ماہانہ آمدنی دو لاکھ روپے سے زائد ہے یعنی انتہائی کم تناسب والے لوگوں کو رعایت دی گئی ہے۔

ہمارا اربن مڈل کلاس طبقہ عام طور پر یہ سمجھتا ہے کہ اصل عام پاکستانی ہم ہیں لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقتاً عام پاکستانی کون ہے؟۔ اپر مڈل کلاس کے گھرانے سمجھتے ہیں کہ ان کے گھروں میں جو ملازمین کام کرنے آتے ہیں وہ غریب لوگ ہیں لیکن اگر ان ملازمین کے گھرانے میں دو تین افراد کمانے والے ہوں اور آپ ان کی مشترکہ تنخواہوں کو جوڑیں تو شاید وہ بھی ایک لاکھ روپے سے زیادہ کما کر اسی 20 فیصد بریکٹ میں آجاتے ہوں۔ ہمارے ہاں لوگوں کو غربت کی حقیقی سطح کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ دیہی علاقوں میں جا کر دیکھیں تو تب معلوم ہوتا ہے کہ اصل اور ہولناک غربت کیا چیز ہے شہروں میں غربت اس سچائی کے ساتھ نظر نہیں آتی۔

ایک اور اہم پہلو جس کے حوالے سے ٹیلی ویژن پر بات نہیں کی جاتی، وہ یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں شہری علاقوں کی نسبت غربت کا تناسب کہیں زیادہ ہے۔ وہاں آمدنی کا بنیادی ذریعہ زراعت ہے۔ حکومت کی جانب سے اب کسانوں پر بھی ایگری کلچرل انکم ٹیکس لاگو کیا گیا ہے۔ ہم نے پاکستان ایگری کلچرل کولیشن (PAC) کے پلیٹ فارم سے پنجاب اور سندھ کی اہم فصلوں سے ہونے والی کسانوں کی آمدنی کا تفصیلی جائزہ لیا، تو

معلوم ہوا کہ آئی ایم ایف (IMF) کی جانب سے حکومت پر شدید دباؤ تھا کہ کسانوں پر بھی تنخواہ دار طبقے کے برابر ٹیکس لاگو کیا جائے۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ جتنا ٹیکس تنخواہ دار طبقے پر لگایا گیا، اتنا ہی ٹیکس کسانوں پر بھی مسلط کر دیا گیا جو کہ ایک انتہائی غلط طریقہ کار ہے۔

کسان ایک کاروباری (Business) شخص کے طور پر کھیتی باڑی کر رہا ہے، وہ کوئی ماہانہ بندھی ہوئی تنخواہ نہیں لیتا۔ تنخواہ دار طبقے میں شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ کمپنی نقصان میں جائے تو ملازمین کو سیلری نہ ملے۔ زیادہ تر حالات میں کمپنی نقصان میں بھی ہو تب بھی ملازم کو تنخواہ مل ہی جاتی ہے، اس لیے انہیں کاروبار جیسے خطرے یا شدید غیر یقینی صورتحال کا سامنا نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ کسان ایک انتہائی رسکی بزنس چلا رہا ہے، اس لیے جب حکومت کی جانب سے ان پر تنخواہ دار طبقے والا ٹیکس ہی لاگو کر دیا گیا تو ان کے لیے شدید معاشی مسائل کھڑے ہو گئے۔ پاکستان کے 95 فیصد کسان جو پنجاب یا سندھ میں گندم، مکئی یا چاول اگا رہے ہیں، وہ سالانہ چھ لاکھ روپے سے اوپر نہیں کما پاتے۔ اس لیے یہ کسان بھی دراصل اسی عام آدمی کی فہرست میں آتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ یہ 80 فیصد افراد وہ عام پاکستانی ہیں جو ماہانہ ایک لاکھ روپے سے کم پر گزارا کر رہے ہیں، تو یہ بات معاشی اعداد و شمار کے عین مطابق ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ 80 سے 90 فیصد کے درمیان والے خوشحال لوگ عام آدمی ہیں، تو یہ بالکل غلط تاثر ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں تفصیلی ذکر کیا ہے کہ عام آدمی کے حالات کس طرح بہتر ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے قومی سطح پر کی جانے والی رواجی گفتگو سے ہٹ کر یہ دیکھنے کی

ضرورت ہے کہ ہمارے لوگ درحقیقت کون سے کام کر کے اپنی روزی کما رہے ہیں۔ اکثر حکومت کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم نے اتنے لاکھ نئے روزگار کے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ جب امریکہ یا دیگر ترقی یافتہ ممالک یہ بات کرتے ہیں تو وہاں حقیقتاً معاشی پالیسیوں کے ذریعے روزگار کے نئے مواقع پیدا کیے جاتے ہیں لیکن پاکستان میں جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے تو میں کئی سالوں سے اس پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اگر سالانہ بنیادوں پر 16 لاکھ جوان 18 سال کی عمر کو پہنچ رہے ہیں اور وہ اپنی بقا کے لیے مجبوراً کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ کام شروع کر دیتے ہیں، تو ہماری لیبر فورس کے اعداد وشمار میں ان 1.6 ملین لوگوں کا اندراج کر کے حکومت کہہ دیتی ہے کہ ہم نے 16 لاکھ نئے روزگار فراہم کر دیے۔ یہ انتہائی گمراہ کن بات ہے کیونکہ وہ بیچارے تو اپنی مدد آپ کے تحت کچھ نہ کچھ مزدوری کر رہے ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے کوئی باقاعدہ نوکریاں پیدا نہیں کی جاتیں۔

میں آپ کے سامنے کچھ حقائق اور اعداد وشمار رکھتا ہوں۔ سال 2015ء میں پاکستان میں پونے چھ کروڑ (57.5 ملین) محنت کش کام کر رہے تھے جبکہ اس دہائی کے اختتام تک پونے آٹھ کروڑ (7.75 ملین) لوگ کام کر رہے ہیں یعنی 10 سال کے دوران تقریباً دو کروڑ مزید لوگ محنت کشوں کی صف میں شامل ہوئے ہیں جو کہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ اگر آپ جائزہ لیں کہ یہ دو کروڑ لوگ آخر کہاں گئے؟ تو وزراء کی باتیں سن کر یوں لگتا ہے جیسے تمام لوگ جدید معیشت، سروسز یا آئی ٹی (IT) کے شعبے میں چلے گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ غیر منظم زراعت کی

طرف دھکیلے گئے جو کام دیگر ترقی پذیر مما لک میں اب مشینوں کے ذریعے ہو رہے ہیں، مثلاً فصل کی کٹائی، بیج کی بوائی وغیرہ، وہ ہمارے ملک میں آج بھی انسانی ہاتھوں سے لیے جارہے ہیں۔ ہماری خواتین 45 ڈگری سینٹی گریڈ کی شدید گرمی اور سخت حالات میں چاول کی بوائی کر رہی ہوتی ہیں اور ظاہر ہے ان کے چھوٹے بچے بھی انہی کے ساتھ اس مزدوری میں لگ جاتے ہیں۔ اور اس پر حکومت بے حسی سے کہہ دیتی ہے کہ ہم نے روزگار کے مواقع فراہم کر دیے۔ ہم اسے ہرگز روزگار کے مواقع پیدا کرنا نہیں کہیں گے کیونکہ ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ اگر وہ گاؤں میں زراعت سے وابستہ نہیں ہو گا تو شہر آ کر کسی کے گھر میں کام کرنا شروع کر دے گا یا سڑک پر مزدوری کرے گا۔

پچھلے 10 سالوں کا موازنہ کریں تو 10 سال پہلے تقریباً ڈھائی کروڑ لوگ زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے اور تقریباً ڈھائی کروڑ افراد ہی اب بھی اس پیشے سے منسلک ہیں۔ دنیا بھر میں معاشی ترقی کے پیٹرن کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب زراعت کے شعبے میں حقیقی ترقی ہوتی ہے تو اس میں لوگوں کی ملازمتوں میں اضافے کے بجائے کمی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہم دس افراد کا کام ایک جدید مشین کی مدد سے لیں گے تو افرادی قوت کا استعمال کم ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں زراعت کی ماڈرنائزیشن کا یہ عمل بہت سست ہے حالانکہ اسے بہت تیزی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اگر چین اور جنوبی کوریا کے اعداد وشمار کا جائزہ لیا جائے تو وہاں یہ ساختاتی تبدیلی بہت تیزی سے آئی ہے یعنی لوگ اب روایتی زراعت پر منحصر نہیں رہے بلکہ دیہی علاقوں میں

موجود چھوٹی اور درمیانی انڈسٹریز میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اگر مینوفیکچرنگ (صنعت) کے شعبے کو دیکھیں تو 10 سال پہلے اس سے 90 لاکھ کے قریب لوگ وابستہ تھے جبکہ اب یہ تعداد بڑھ کر سوا کروڑ ہوگئی ہے۔اس شعبے سے وابستہ وہ افراد جن کے پاس کسی بھی قسم کی فنی مہارت ہو، وہ دیہی علاقوں میں کھیتوں میں ہاتھ سے مشقت کرنے والوں کی نسبت بہتر تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ جو تقریباً 28 لاکھ نئی جابز شامل ہوئی ہیں ان کو ہم حقیقتاً باوقار روزگار کے مواقع کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ رجسٹرڈ اور منظم کمپنیاں ہیں جو لوگوں کو باقاعدہ ملازمتیں فراہم کرتی ہیں

اس کے علاوہ ہول سیل اور ریٹیل (تجارتی) شعبے سے بھی بہت بڑی تعداد وابستہ ہے۔ان دکانوں اور تجارتی مراکز میں کام کرنے والے تمام لوگ مالکان نہیں ہوتے بلکہ ایک بہت بڑی تعداد دیہاڑی دار یا ماہانہ ملازمین کی ہے۔اعداد وشمار کے مطابق تقریباً 40 لاکھ لوگ دکانوں پر نوکریاں کر رہے ہیں۔تعمیرات کے شعبے سے تقریباً 35 لاکھ افراد وابستہ ہیں جن میں زیادہ تر آرکیٹیکٹس یا انجینئرز شامل نہیں ہیں بلکہ بڑی تعداد غیر ہنرمند اور نیم ہنرمند مزدور طبقے پر مشتمل ہے۔ٹرانسپورٹ کے شعبے سے بھی 20 لاکھ کے قریب لوگ منسلک ہیں۔

آپ کے سامنے یہ تفصیلات اور اعداد وشمار رکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پچھلی دہائی میں شامل ہونے والے دو کروڑ افراد میں سے تقریباً سوا کروڑ افراد ایسے ہیں جنہوں نے شدید غیر یقینی اور غیر منظم شعبوں میں معمولی اور کم اجرت والی ملازمتیں اختیار کی ہیں۔جب ہم یہ بات کرتے ہیں کہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت کیا اقدامات کر رہی

ہے تو حکومت کی جانب سے اکثر کم سے کم تنخواہ میں اضافے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔لیکن بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مارکیٹ میں ہر شخص کو حکومت کی طے شدہ یہ قانونی تنخواہ مل بھی رہی ہے یا نہیں؟ اعلان تو کر دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت غیر منظم شعبے میں طے شدہ تنخواہ نہیں دی جاتی۔

اگر بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومتی ملازمین کی بات کی جائے تو وہ بھی خود کو اسی عام آدمی کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ دیہی اور شہری دونوں علاقوں کے افراد سرکاری نوکری کے حصول کے شدید خواہاں ہوتے ہیں کیونکہ سرکاری ملازمت میں باقاعدہ آمدنی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ صحت کی سہولیات، جاب سیکیورٹی اور ریٹائرمنٹ کے بعد پینشن ملتی ہے۔جس میں ہر سال بجٹ میں باقاعدہ اضافہ بھی ہوتا ہے۔حالیہ بجٹ میں بھی حکومت کی جانب سے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں 20 سے 25 فیصد (اور کچھ کیڈر میں 7 سے 10 فیصد پینشن) اضافے کے اعلانات کیے گئے ہیں اور صوبائی سطح پر بھی ملازمین کی مراعات بڑھائی گئی ہیں۔

لیکن آپ معاشی صورتحال کو اس حقیقی تناظر میں دیکھیں کہ 2020ء کے بعد سے جس طرح مہنگائی میں مسلسل اور ہولناک اضافہ ہوتا چلا آیا ہے۔اگرچہ اب شرحِ اضافہ میں کسی حد تک کمی آئی ہے لیکن پچھلے پانچ چھ سال کا مجموعی جائزہ لیں تو جو چیز 2020ء میں 100 روپے کی تھی وہ چیز اب عام بازاروں میں 200 سے 220 روپے یا اس سے بھی زیادہ مہنگی بک رہی ہے۔مجھے اس بات پر شدید افسوس ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن پر بیٹھ کر ماہرین اور معاشی تجزیہ کار اکثر یہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کور انفلیشن (Core

(Inflation) دیکھیں تو اس لحاظ سے ہماری معیشت بالکل ٹھیک کام کر رہی ہے۔

آپ کو یہ لازماً سمجھنا چاہیے کہ "کور انفلیشن" کی حساب کتاب سے خوراک (Food) اور توانائی (Energy/Gas/Electricity) کی قیمتوں کو نکال دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی دو چیزیں عام آدمی اور غریب خاندان کی زندگی پر سب سے زیادہ اور براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ جب آپ میڈیا پر اس طرح کی تکنیکی گفتگو سن رہے ہوں تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کور انفلیشن معیشت کی مجموعی منصوبہ بندی اور مینوفیکچرنگ سیکٹر کے لیے تو ایک اشاریہ ہو سکتا ہے لیکن جب بات عام آدمی کے باورچی خانے کی ہو، تو بنیادی چیز خوراک اور بجلی/گیس کی قیمتیں ہی ہیں، جن کا اوپر جانا غریب اور مڈل کلاس کے لیے انتہائی ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے۔

جب ہم پاکستان کے غریب ترین طبقے (ذیلی 20 فیصد افراد) کی بات کرتے ہیں، تو بینظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) کو بلاشبہ دنیا کے بہترین اور شفاف ترین سوشل سیفٹی پروگرامز میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت اس وقت ایک کروڑ سے زائد انتہائی مستحق خاندان فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس پروگرام میں بھی کئی انتظامی نقائص اور کرپشن کی خبریں سامنے آتی رہی ہیں حتیٰ کہ ماضی میں 20 ویں گریڈ کے افسران کی بیگمات بھی اس میں غیر قانونی طور پر رجسٹرڈ پائی گئیں۔ لیکن اس تمام تر نظام کے باوجود بہت بڑی تعداد میں حقیقی غریب اور مستحق لوگ اس سے مالی سہارا حاصل کر رہے ہیں۔ 2020ء میں اس پروگرام کے تحت فی خاندان ماہانہ تقریباً 1,500 روپے دیے جاتے تھے جبکہ آئندہ مالی سال کے لیے اس رقم کو بڑھا کر تقریباً 4,000

طروپے ماہانہ (سہ ماہی قسط کی صورت میں) کر دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے بجٹ میں 592 ارب روپے سے زائد (اور مجموعی سوشل پروٹیکشن کے لیے 838 ارب روپے) مختص کیے گئے ہیں جو پچھلے سال کی نسبت نمایاں طور پر زیادہ رقم ہے۔

اب میں چند اہم مثالیں صوبائی بجٹ کی ایلوکیشن کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ پچھلے سال سندھ کے بجٹ میں تعلیم کے لیے 445 ارب روپے مختص کیے گئے تھے، جبکہ آئندہ سال کے لیے اس رقم کو بڑھا کر 551 ارب روپے کر دیا گیا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکومت یہ اربوں روپیہ کہاں خرچ کرتی ہے؟ کیونکہ زمین پر اس کے نتائج اور معیاری تبدیلی نظر نہیں آتی۔ سندھ میں صحت کے شعبے کے لیے بھی 354 ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ دوسری طرف پنجاب کے بجٹ میں صحت کے لیے تقریباً 500 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جبکہ تعلیم کے لیے ساڑھے سات سو (750) ارب روپے رکھے گئے ہیں جو کہ پورے پنجاب کے بجٹ کا تقریباً 15 فیصد بنتا ہے۔ اس ساڑھے سات سو ارب میں سے 484 ارب روپے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن اتھارٹیز (DEAs) کو منتقل ہوتے ہیں، جہاں سے یہ رقوم مختلف اسکول مینجمنٹ کمیٹیوں (SMCs) کے اکاؤنٹس میں جاتی ہیں۔ اس رقم کے دو بنیادی حصے ہوتے ہیں:

1۔ پہلا حصہ اساتذہ اور اسکول عملے کی تنخواہوں کی ادائیگی میں جاتا ہے۔

2۔ دوسرا حصہ سرکاری اسکولوں کی دیکھ بھال، بنیادی سہولیات اور مرمتی و تعمیراتی کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔

حکومتِ پنجاب کا موجودہ نقطہ نظر یہ ہے کہ جو بچے پہلے سے اسکولوں سے باہر (Out of School) ہیں۔ان کے لیے بالکل نئے اسکولوں کی عمارتیں کھڑی کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ پہلے سے موجود ڈھانچے اور اسکولوں کی حالت کو بہتر سے بہترین بنایا جائے تاکہ بچوں کو ایک فعال اور پرکشش ماحول میسر آسکے۔جب یہ پیسہ اسکول مینجمنٹ کمیٹیز کے اکاؤنٹ میں جاتا ہے تو پنجاب میں اس کے آڈٹ کے لیے ایک باقاعدہ لسٹ اور گائیڈ لائنز دی جاتی ہیں۔پنجاب کے دیہی علاقوں اور چھوٹے قصبوں میں جا کر دیکھیں تو واقعی کئی اسکولوں کے ڈھانچے میں چمک نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انفراسٹرکچر پر رقم خرچ کی گئی ہے۔

اگر ہم وفاق اور تمام صوبائی بجٹس کو ملا کر دیکھیں تو تقریباً 1.5 ٹریلین (ڈیڑھ کھرب) روپے کی رقم بنتی ہے جو ملک بھر میں تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے۔یہ رقم ہماری قومی جی ڈی پی (GDP) کا محض 1.5 سے 1.7 فیصد بنتی ہے جو کہ عالمی معیار کے لحاظ سے انتہائی کم ہے۔اصولاً پاکستان کو اپنی جی ڈی پی کا کم از کم 4 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے۔60 اور 70 کی دہائی میں ملائیشیا اور جنوبی کوریا جیسے ممالک اپنی جی ڈی پی کا 7 سے 8 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرتے تھے کیونکہ ان کی بنیادی ترجیح ملک بھر میں اسکولوں کا عالمگیر انفراسٹرکچر اور ڈھانچہ کھڑا کرنا تھی۔جب ڈھانچہ بن جاتا ہے تو اس کے بعد صرف اساتذہ کی تربیت اور دیکھ بھال کا خرچہ رہ جاتا ہے۔

لیکن یہاں سب سے بڑا اور ہولناک سوال یہ ہے کہ کیا پنجاب اور ملک بھر کے اسکولوں میں بچوں کو کوئی معیاری تعلیم مل بھی رہی ہے یا نہیں؟ میں ”ادارہ تعلیم و آگہی“

(ITA/ ASER PAKISTAN) سے بھی منسلک رہا ہوں، جس کے تحت ہم ملک گیر تعلیمی سروے کرتے ہیں۔ہمارے سروے کے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔اسکولوں میں چوتھی اور پانچویں جماعت کے طلباء دوسری جماعت کی آسان اردو/سندھی کی کتابیں نہیں پڑھ پاتے اور نہ ہی حساب اور ریاضی کے بنیادی سوال (جمع،تفریق یا تقسیم) حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پٹرولیم لیوی کا معاملہ عام آدمی اور معیشت کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر پچھلے سال کا جائزہ لیں تو تقریباً 1.5 ٹریلین (ڈیڑھ کھرب) روپے صرف پٹرولیم لیوی کی مد میں جمع کیے گئے تھے۔گزشتہ مالی سال کے دوران پاکستانیوں نے ٹرانسپورٹ کے شعبے میں 21 ارب لیٹر سے زائد ایندھن استعمال کیا یعنی حکومت نے اوسطاً فی لیٹر پٹرول و ڈیزیل پر 80 روپے کے قریب لیوی وصول کی ہے۔حالیہ بجٹ میں مزید 1.6 ٹریلین روپے کی ریکارڈ پٹرولیم لیوی لاگو کرنے کا ہدف رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فی لیٹر پٹرول پر زیادہ سے زیادہ لیوی وصول کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔لیکن اگر بین الاقوامی سطح پر خام تیل کی قیمتوں میں کمی آتی ہے یا عالمی حالات (جیسے ایران اور امریکہ کے تعلقات اور معاہدوں) کی وجہ سے ایندھن سستا ہوتا ہے، تو اس کا فائدہ عوامی سطح پر منتقل ہونا چاہیے اور لیوی کی شرح میں کمی کی جانی چاہیے۔

اگر ماضی کا موازنہ کریں تو 2005ء کے قریب پاکستان میں وفاقی حکومت کے کل ٹیکس ریونیو کی ساخت پر شدید تنقید کی جاتی تھی کیونکہ اس وقت بلاواسطہ ٹیکسوں کا تناسب بہت زیادہ تھا، جو براہِ راست عام آدمی کی جیب پر بوجھ ڈالتے ہیں۔معاشی

اصولوں کے مطابق کسی بھی ترقی پذیر ملک میں بالواسطہ یعنی ڈائریکٹ ٹیکس کا حصہ زیادہ ہونا چاہیے تاکہ صاحبِ ثروت طبقہ اپنی آمدنی کے مطابق ٹیکس دے۔ موجودہ اور آئندہ مالی سال کی پیش رفت میں ایک مثبت تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ اب کل ریونیو کا تقریباً 50 فیصد حصہ براہِ راست سے وصول کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے، جبکہ تقریباً 32 فیصد حصہ سیلز ٹیکس کی مد میں حاصل کیا جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں مسلسل بڑھتی ہوئی غربت کو ختم کرنے کا حل صرف لوگوں کو گرانٹ یا پیسے بانٹنا نہیں ہے بلکہ ہمیں لوگوں کی کمانے کی صلاحیت، ہنر اور پروڈکٹیوٹی کو بڑھانے کے لیے انسانوں پر سرمایہ کاری کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ حکومتِ وقت کی ترجیحات میں عام آدمی ویسے بھی نظرانداز رہتا ہے اور چونکہ قومی وسائل محدود ہیں اس لیے جس پیمانے پر نچلی سطح پر بنیادی بہتری اور خوشحالی آنی چاہیے وہ فی الحال کہیں نظر نہیں آ رہی۔ اسی صورتحال، عوامی تحمل اور حکومت کے رویے پر احمد فراز صاحب کا یہ مشہور اور حسبِ حال شعر صادق آتا ہے:

؎ تمہیں بھی ضد ہے کہ مشقِ ستم رہے جاری
ہمیں بھی ناز ہے، جور و جفا کے عادی ہیں
تمہیں بھی زعم، مہابھارت لڑی تم نے
ہمیں بھی فخر، کہ ہم کربلا کے عادی ہیں

زاہد فاروق: محترم جناب کاظم سعید صاحب! آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں اور باریکیوں کی نشاندہی کی تاکہ ایک عام آدمی بجٹ

کے اس پیچیدہ گورکھ دھندے کو آسانی سے سمجھ سکے۔ حالانکہ بجٹ ایک انتہائی خشک موضوع ہے جو عام لوگوں کو آسانی سے سمجھ نہیں آتا۔ کیونکہ وفاق اپنے اعداد و شمار پیش کرتا ہے، صوبے اپنا مؤقف رکھتے ہیں اور اب عنقریب کے ایم سی (KMC) اور کے ڈی اے (KDA) کے بلدیاتی بجٹ بھی سامنے آئیں گے، جن میں یہ دیکھنا باقی ہے کہ محنت کش اور مزدور طبقے کے لیے کیا عملی اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بنیادی انفراسٹرکچر اور ترقیاتی منصوبوں کے حوالے سے چاہے وفاقی حکومت کا بجٹ ہو، صوبائی حکومت کا یا کے ایم سی کا تخمینہ شدہ رقم درست اور شفاف طریقے سے خرچ نہیں ہو پاتی۔ ایک طرف تو مسلسل یہ رونا رویا جاتا ہے کہ حکومت کے پاس سڑکیں بنانے، پانی اور سیوریج کی لائنیں بچھانے، سروس کی گاڑیاں خریدنے یا عوامی پارکوں کو بحال کرنے کے لیے فنڈز میسر نہیں ہیں جبکہ دوسری طرف حقیقت یہ دکھائی دیتی ہے کہ بجٹ میں ان بنیادی شہری سہولیات کے لیے مختص کی گئی 50 فیصد سے زائد رقم استعمال ہی نہیں کی جاتی اور یوں ہی لیپس (Lapse) ہو جاتی ہے۔

عارف حسن: یہ تمام حکومتوں کا ایک خاص طریقہ کار ہے کہ ترقیاتی بجٹ کے فنڈز کو وہ سال کے بالکل آخر میں یعنی جنوری، فروری اور مارچ کے مہینوں میں جا کر ریلیز اور خرچ کرنا شروع کرتے ہیں۔ اب آپ خود سوچیں کہ چند مہینوں میں اتنا بڑا بجٹ کس طرح شفاف انداز میں ختم ہو سکتا ہے؟ لیکن حکومتیں اور بیوروکریسی ایسا کیوں کرتی ہیں، یہ بات آج تک میری سمجھ سے بھی بالاتر ہے۔

مہمان: میرا سوال کاظم سعید صاحب سے ہے۔ ابھی آپ نے پنجاب کے تعلیمی

بجٹ کے حوالے سے بات کی، تو میرا سوال یہ ہے کہ جب پنجاب حکومت اپنے سرکاری ایجوکیشن سسٹم اور اسکولوں کی بڑے پیمانے پر نجکاری کر رہی ہے، تو پھر تعلیم کے لیے اتنا بھاری بجٹ مختص کرنے کی کیا منطق اور ضرورت ہے؟

کاظم سعید: آپ نے بالکل بجا اور مناسب سوال کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ پنجاب میں اس وقت تقریباً 48 ہزار سرکاری اسکول موجود ہیں۔ ان میں سے تقریباً 12 ہزار اسکولوں کو انتظامی طور پر آؤٹ سورس (نجکاری/ پی پی پی) کیا جا چکا ہے اور مزید اسکولوں کی نجکاری کا عمل بھی جاری ہے۔ لیکن اس آؤٹ سورسنگ کے باوجود حکومت کے پاس اب بھی 36 ہزار سے زائد اسکولوں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک براہِ راست موجود ہے۔ تو بجٹ کا یہ خطیر حصہ انہی 36 ہزار اسکولوں، اساتذہ کی تنخواہوں، انفراسٹرکچر اور انتظامی املاک کی دیکھ بھال پر خرچ ہو رہا ہے۔

مہمان: پاکستان میں جتنی بھی مینوفیکچرنگ انڈسٹریز موجود ہیں، وہ ترقی کرنے اور پھیلنے کے بجائے مسلسل بند ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر ٹیکسٹائل سیکٹر میں کام اور آرڈرز اتنے کم ہو گئے ہیں کہ اب ہمارے پاس عالمی معیار کی بڑی انڈسٹری نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایگری کلچر پروسیسنگ میں بھی کوئی بڑی انڈسٹری قائم نہیں ہو سکی۔ ایسی صورتحال میں حکومت کے پاس ایسا کوئی پلیٹ فارم یا شعبہ ہی نہیں بچا جہاں وہ لوگوں کو باوقار ملازمتیں فراہم کر سکے۔

کاظم سعید: آپ نے بالکل درست نشاندہی کی۔ میں بھی اسی بات کی وضاحت کر رہا تھا کہ جب صنعتی ملازمتیں ختم ہوتی ہیں تو مزدور مجبوری میں ان غیر منظم شعبوں کی طرف

رخ کرتے ہیں جہاں غیر تربیت یافتہ لوگ کام کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کہیں تعمیراتی کام چل رہا ہے، تو لوگ وہاں دیہاڑی دار مزدور کے طور پر لگ جاتے ہیں لیکن یہ وہ ملازمتیں نہیں ہیں جن میں ورکرز کو ملازمت کا تحفظ، سوشل سیکیورٹی یا مراعات میسر ہوں۔ جب انڈسٹریل جابز نہیں ہوتیں تو لوگ مجبوراً کھیتوں یا مزدوری پر چلے جاتے ہیں۔

جہاں تک ٹیکسٹائل انڈسٹری کے بحران کا تعلق ہے تو کچھ معاشی حقیقتیں ہیں جن کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اگر آپ 1964ء کی پرانی ٹیکنالوجی سے 1974ء اور 1984ء میں کپڑا بنا رہے تھے تو وہ شاید چل جاتا تھا لیکن اگر آپ 2014ء یا 2026ء کے دور میں بھی 60 سال پرانی ٹیکنالوجی استعمال کر کے عالمی مارکیٹ کا مقابلہ کرنا چاہیں گے تو ایسا ناممکن ہے۔ جب فیکٹریاں بند ہوتی ہیں تو مل مالکان کو خود بھی سیلف اسیسمنٹ کرنی چاہیے کہ وہ کہاں غلطی کر رہے تھے اور جدت کیوں نہیں لائے۔

میرا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہم ساری زندگی صرف روایتی ٹیکسٹائل انڈسٹری پر ہی انحصار کرتے رہیں گے؟ کیا ہم کبھی مصنوعات میں تنوع (Diversification)، الیکٹرانکس اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس (AI) جیسے جدید شعبوں کی طرف نہیں آئیں گے؟ میں آپ کو اس کی ایک عالمی اور تاریخی مثال دیتا ہوں۔ آپ تمام لوگ سام سنگ (Samsung) کے نام سے خوب واقف ہیں۔ سام سنگ نے 1930ء کی دہائی میں اپنا کاروبار ایک معمولی نوڈلز بنانے والی فیکٹری سے شروع کیا تھا۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان کی قیادت نے یہ محسوس کیا کہ انہیں کچھ الگ کرنا چاہیے چنانچہ وہ

ٹیکسٹائل کی طرف آئے اور کاٹن سے لے کر ٹیکسٹائل ایکسپورٹ تک کی مکمل سپلائی چین قائم کی۔اس کے بعد 1970ء کی دہائی میں سام سنگ کے مالکان نے ایک جرات مندانہ اور تاریخی فیصلہ کیا۔انہوں نے دیکھا کہ دنیا کا مستقبل کمپیوٹرز ہیں، لہٰذا ہمیں سیمی کنڈکٹر اور کمپیوٹر چپس کی مینوفیکچرنگ کی طرف جانا چاہیے حالانکہ اس زمانے میں سیمی کنڈکٹر چپس خود امریکہ کے لیے بھی ایک بالکل نئی ٹیکنالوجی تھی۔سام سنگ نے اس میں اختراع (انویشن) کی اور آج وہ دنیا کی سب سے بڑی ٹیک کمپنیوں میں سے ایک ہے۔

ہمارے ہاں کیا ہوا؟ پاکستان میں شاید صرف ایک یا دو ایسی ٹیکسٹائل انڈسٹریز تھیں جن کے مالکان نے بصیرت دکھائی اور جب ان کا ٹیکسٹائل یونٹ بند ہوا تو انہوں نے اس کی جگہ ٹیلی ویژن، ایل سی ڈی (LCD) اور الیکٹرانکس کے پلانٹس لگائے۔ باقی لوگ جدت لانے کے بجائے پرانے ڈھانچے کو ہی روتے رہے۔

مہمان: بینظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) کے لیے اس سال کے بجٹ میں 838 ارب روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی ہے۔میرا سوال یہ ہے کہ حکومت یہی اربوں روپے کی رقم انڈسٹریز اور پروڈکٹیو سیکٹر میں سرمایہ کاری کے لیے کیوں استعمال نہیں کرتی؟ تاکہ لوگوں کو ہنر اور روزگار کے مواقع ملیں، نہ کہ انہیں محض رقم بانٹ کر بھکاری بنایا جائے؟

کاظم سعید: وہ بھکاری نہیں ہیں وہ حقیقت میں غربت کی لکیر پر اس سے بھی نیچے کی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔اگر آپ کو کبھی موقع ملے تو بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے غربت اسکور کارڈ (Proxy Means Test) کے ڈیٹا شیٹ کو دیکھیں۔اس

یں پوچھا جاتا ہے کہ کیا آپ کے پاس سائیکل، موٹر سائیکل یا گاڑی ہے؟ کیا گھر میں ایک کمرے میں چار لوگ رہتے ہیں یا ایک شخص؟ جب آپ ان تمام سوالات کے جوابات فل کرتے ہیں، تو جن کا اسکور 16 یا اس سے کم آتا ہے، وہ شدید ترین کسمپرسی اور غربت کی آخری لکیر سے بھی نیچے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ ٹیلی ویژن ٹاک شوز میں بیٹھ کر غریبوں اور سوشل سیفٹی نیٹس کے خلاف کی جانے والی سطحی گفتگو کو بلا تحقیق بالکل تسلیم نہ کیا کریں۔ یہ امداد ان کی بقا کا آخری سہارا ہے۔

رانا صادق (کمیونٹی ایکٹیوسٹ): میں یہ بات رکھنا چاہتا ہوں کہ سندھ کے بجٹ میں ہر سال باقاعدہ ترقیاتی بجٹ کا اعلان تو کیا جاتا ہے لیکن جب ہم زمینی سطح پر دیکھتے ہیں تو حقیقی ترقی اور بنیادی انفراسٹرکچر کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ دوسری اہم بات میں کم سے کم اجرت پر کام کرنے والے تنخواہ دار طبقے کے حوالے سے کرنا چاہوں گا۔ حکومت کی جانب سے کم از کم ماہانہ تنخواہ کا اعلان تو کر دیا جاتا ہے لیکن ہماری انڈسٹریل بیلٹس اور شہروں میں بے شمار فیکٹریاں ایسی ہیں جو غیر رجسٹرڈ ہیں اور جہاں کام کرنے والے غریب مزدوروں کو حکومت کے طے شدہ معیار سے بہت کم اجرت دی جاتی ہے۔

مزید برآں، ان غریب مزدوروں کو نہ تو Social Security میسر ہے اور نہ ہی کسی قسم کا قانونی تحفظ یا مراعات دی جاتی ہیں۔ میری یہ گزارش ہے کہ ہمیں اس مظلوم تنخواہ دار طبقے کے حقوق اور ان کے مالی استحصال پر بھی سنجیدگی سے بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایک بہت بڑا طبقہ ایسی فیکٹریوں اور ورکشاپس میں کام کر رہا ہے جہاں ان کا

شدید معاشی استحصال جاری ہے۔ شکریہ

فرحت (ناؤ کمیونٹیز): سب سے پہلے تو میں کاظم سعید صاحب کی گفتگو میں اشعار کے خوبصورت انتخاب کو بہت سراہتی ہوں۔ ہم نے حال ہی میں اربن ریسورس سینٹر (URC) کے پلیٹ فارم سے ایک فیلڈ سروے مکمل کیا ہے، جس کے تحت 300 کام کاج کرنے والے ورکرز اوران کے خاندانوں کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اس وقت اگرچہ حکومت کی جانب سے کم سے کم اجرت 40,000 روپے ماہانہ مقرر کی گئی ہے لیکن اپنے سروے کے دوران ہم نے یہ تلخ حقیقت دیکھی کہ اگرکسی ایک گھرانے کے تین افراد بھی مسلسل محنت ومشقت کررہے ہوں تو ان تینوں افراد کی مجموعی ماہانہ تنخواہ مل کر مشکل سے 42,000 تا 49,000 روپے بنتی ہے۔

میرا بنیادی سوال یہ ہے کہ ہماری حکومتی پالیسیوں اور معاشی منصوبوں کی توجہ شہری غربت (Urban Poverty) کو کم کرنے کی طرف کیوں نہیں ہے؟ ہمارے اعداد وشمار کے مطابق تقریباً 80 فیصد محنت کشوں اور مزدوروں کے بچے کبھی اسکول کی دہلیز تک نہیں جاسکے اوران کے اسکول نہ جانے کی سب سے بڑی وجہ مہنگی بجلی اور پٹرول کی مسلسل بڑھتی ہوئی قیمتیں ہیں۔ کیونکہ ہر بچے کی بستی یا محلے کے قریب سرکاری اسکول موجود نہیں ہے اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات غریب کی برداشت سے باہر ہو چکے ہیں۔ سب سے زیادہ تشویشناک اور دردناک بات یہ ہے کہ ان بے روزگار یا انتہائی کم اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں میں ایک بہت بڑی تعداد ان نوجوانوں کی ہے جو میٹرک، انٹر یا کم از کم مڈل تک تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

جہاں تک بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کا تعلق ہے تو میں کسی حد تک آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں لیکن میرا پختہ موقف یہ ہے کہ صرف نقد رقم یا سبسڈی (Cash Transfers) دینے کے بجائے حکومت کو افراطِ زر اور مہنگائی کو کنٹرول کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ اگر بازار میں مہنگائی مسلسل بڑھتی رہے گی تو چند ہزار روپے کی اس رقم کا غریب کی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑے گا۔ ہم ہر بجٹ میں دیکھتے ہیں کہ حکومت گورننس اور انتظامی اخراجات کی مد میں ہر بار اپنا بجٹ بڑھا لیتی ہے جبکہ بیوروکریسی اور حکومت کی عملی کارکردگی ہم سب کے سامنے ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس اخراجات کی عدم مساوات پر بھی بات کریں۔

اس کے علاوہ، جب ہم عام مزدور کے لیے EOBI (اولڈ ایج بینیفٹس)، سوشل سیکیورٹی یا ورکرز ویلفیئر فنڈز کی معمولی رقم کا موازنہ اعلیٰ سرکاری ملازمین یا ریٹائرڈ افسران کی بھاری پینشنز سے کرتے ہیں، تو یہ فرق انتہائی دردناک نظر آتا ہے۔ اس ناہمواری پر بھی آپ روشنی ڈالیں۔ بہت شکریہ

کاظم سعید: وقت کی کمی کے باعث میں آپ کے سوالات کا مختصراً جواب دینا چاہوں گا۔ آپ نے اگرچہ چار اہم سوالات کیے ہیں لیکن میں ایک خاص سوال کا جواب لازماً دینا چاہوں گا جو بہت زیادہ غور طلب ہے۔ آپ نے کہا کہ شہری غربت کے خاتمے کے لیے حکومتوں کی جانب سے کوئی کام نہیں کیا جا رہا تو میں آپ کو بتا تا چلوں کہ ہمارے ہاں دیہی علاقوں میں بھی غربت کے خاتمے پر کوئی خاص اور پائیدار توجہ نہیں دی جاتی۔

اگر آپ ہماری سیاسی معیشت کے ساختیاتی فریم ورک کو سمجھیں تو جو لوگ بھی اقتدار

کے ایوانوں میں موجود ہوتے ہیں ان کی تمام تر ترجیح اور توجہ صرف ایلیٹ کلاس یا اوپری طبقے پر ہوتی ہے کہ ان کی مراعات کا تحفظ کیسے کیا جائے اور انہیں مزید سہولیات کیسے دی جائیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دکھاوے اور سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لیے نچلے طبقے کو بھی کچھ نہ کچھ فنڈز یا عارضی فوائد منتقل کر دیتے ہیں، چاہے وہ ان کی بنیادی ضروریات کے مقابلے میں بالکل ناکافی ہی کیوں نہ ہوں۔مثال کے طور پر مخصوص طبقوں کے لیے سبسڈی، ٹریکٹر اسکیمز یا وقتی امدادی پیکجز وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔

غریبوں کے لیے یہ تھوڑا بہت کام کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت امداد دے کر اپنا فرض پورا کر رہے ہیں حالانکہ مستقل بنیادوں پر غربت کے خاتمے، پیداواری صلاحیت اور ہنر مندی بڑھانے کے لیے کوئی دانشمندانہ کام نہیں کیا جا رہا۔اگر ہم چین کی تاریخی مثال لیں تو چین نے ماضی قریب میں ریکارڈ سطح پر کروڑوں لوگوں کو غربت سے نکالا ہے۔چین نے بڑی سطح پر دیہی علاقوں اور قصبوں میں بنیادی ڈھانچے اور انڈسٹری کی تعمیر کی تاکہ عام لوگوں کو اپنے ہی علاقوں میں روزگار کے پائیدار مواقع میسر آسکیں۔

مہمان: سب سے پہلے تو میرا سوال یہ ہے کہ پٹرولیم لیوی کے حوالے سے آپ نے جو بات کی تو یہ کس طرح عوام پر لاگو ہوتی ہے اور کس انداز میں وصول کی جاتی ہے؟ اس بارے میں تھوڑا آسان الفاظ میں سمجھا دیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے "اپنا گھر، اپنی چھت" یا مساوی ہاؤسنگ اسکیمز کا اعلان کیا جاتا ہے تو اس میں ایک عام اور غریب آدمی کس طرح سے حصہ لے

سکتا ہے؟ کیونکہ جس شخص کی آمدنی یا تنخواہ 60 سے 70 ہزار روپے کے درمیان ہو اکثر صرف وہی ایسے فنانسنگ کے اہل قرار پاتے ہیں۔ پھر غریب مزدور کہاں جائے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ آئی ایم ایف (IMF) ہر بار عام اور غریب عوام کے اوپر تو بھاری ٹیکس لگا دیتی ہے لیکن کیا اسے ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریسی کی عیاشیاں اور بے جا مراعات نظر نہیں آتیں؟ آئی ایم ایف ان حکمرانوں کی مراعات پر ٹیکس کیوں نہیں لگاتی یا انہیں ختم کرنے کا پابند کیوں نہیں کرتی تاکہ عوام کے اوپر سے ٹیکس کا بوجھ کم ہو سکے؟

حسین: ہم اکثر سنتے اور پڑھتے ہیں کہ رئیل اسٹیٹ سیکٹر نے پاکستان کی معیشت کو بہت فائدہ پہنچایا ہے اور اس حوالے سے کئی اعداد و شمار بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ بات کتنی درست اور پائیدار ہے؟

کاظم سعید: رئیل اسٹیٹ سیکٹر کے حوالے سے یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے۔ اگر آپ چین کے معاشی ماڈل کو بھی دیکھیں تو ان کی جی ڈی پی کی ترقی میں ایک بڑا حصہ تعمیراتی شعبے کا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی معاشی حقیقت ہے جو ہمیں پسند ہو یا نہ ہو لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جب تعمیراتی سیکٹر میں سرگرمی بڑھتی ہے تو اس سے منسلک 40 سے زائد شعبے متحرک ہوتے ہیں اور بالواسطہ روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں تقریباً 80 فیصد افراد ایسے ہیں جن کے پاس کوئی اعلیٰ ڈگری یا خاص تکنیکی مہارت نہیں ہوتی کہ وہ چند سالوں میں بہت زیادہ پیسہ کما سکیں۔ لہٰذا ایسے افراد جن کے پاس بہت کم مہارت ہو یا وہ بالکل غیر ہنرمند ہوں، ان کے لیے بھی تو

روزگار اور دیہاڑی کا کوئی طریقہ ہونا چاہیے۔ تعمیرات اور انویسٹمنٹ کا شعبہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو غیر ہنر مند مزدوروں کو فوری روزگار کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے یہ معیشت کی روانی کے لیے کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ شہری اور دیہی علاقوں میں اسکول، ہسپتال اور سڑکیں بنائی جائیں تاکہ ترقی کا عمل تیز ہو سکے۔ اس کے لیے اگر مزید اضافی رقوم کی ضرورت ہو تو وفاقی بجٹ میں رکھے گئے غیر پیداواری یا شاہانہ اخراجات سے کٹوتی کر کے ان عوامی فنڈز میں رقم شامل کی جانی چاہیے۔

مہمان: میں زراعت کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا۔ پہلے زمانوں میں ایک ایکڑ زمین پر ہل چلانے یا تیاری پر بہت کم خرچ آتا تھا لیکن پٹرول اور ڈیزل کی قیمتوں میں بار بار اضافے کی وجہ سے اب لاگت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اگر حکومت زرعی inputs پر مزید ٹیکس لگائے گی، تو بڑا زمیندار تو شاید کسی نہ کسی حد تک اس اضافے کا بوجھ برداشت کر لے یا اپنی فصل مہنگی بیچ دے، لیکن چھوٹا کسان اور مزارع کہاں جائے گا؟ یوریا کھاد کی جو بوری ماضی میں چند سو یا 500 روپے میں مل جاتی تھی، وہ اب بلیک میں یا مارکیٹ میں ہزاروں روپے (10 سے 15 ہزار تک) مل رہی ہے۔

پاکستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے۔ اسی لیے پاکستان کو چلانے کے لیے زراعت کا شعبہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر زراعت کا شعبہ ترقی کرے گا تو ہی پاکستان خوشحال ہو سکے گا۔ میرا سوال یہ کہ حکومت کسانوں اور زراعت کی ترقی و بہتری کے لیے کام کیوں نہیں کرتی؟ تعلیم کے حوالے سے بات کی جائے تو اندرون سندھ میں اگر آپ

اسکولوں کا حال دیکھیں تو اسکولوں کے اندر آپ کو جانور بندھے ہوئے نظر آئیں گے، حکومت اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ اسکول کی دیواریں اور چھتیں خستہ حالی کا شکار ہیں۔ بچے انہی خستہ حال چھتوں کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے پر مجبور ہیں۔ بعض اوقات یہی خستہ حال چھتیں گرنے سے بڑے حادثات بھی رونما ہوتے ہیں۔

بطور پاکستانی ہم چاہتے ہیں کہ وہ غریب بچے جو تعلیم کے حصول کے لیے کچے راستوں پر پیدل تین سے چار کلومیٹر کا سفر طے کر کے اسکول آتے ہیں۔ ان کے لیے ایسا محفوظ انتظام کیا جائے کہ انہیں تحفظ اور معیاری تعلیم میسر آسکے کیونکہ" پڑھے گا پاکستان تو بڑھے گا پاکستان"۔ میرا سوال یہ ہے کہ حکومت تعلیم کے اس بنیادی ڈھانچے کے لیے کیا عملی کام کر رہی ہے؟

رعشا(کراچی سیٹزن فورم): آپ نے چین میں ہونے والی انفراسٹرکچر کی تعمیرات کے حوالے سے بات کی کہ کس طرح وہاں وسیع پیمانے پر ترقیاتی کاموں کے ذریعے لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے۔ چین میں تو پیداواری اور صنعتی تعمیرات بنیادی طور پر روزگار اور معاشی روانی پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں لیکن جب ہم پاکستان میں تعمیراتی سیکٹر کا طریقہ کار دیکھتے ہیں تو یہاں زیادہ تر صرف کمرشل اور رہائشی پلاٹنگ یا ہاؤسنگ ہی نظر آتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس قسم کی غیر پیداواری تعمیرات سے عوام کو پائیدار اور دیرپا روزگار کے مواقع میسر نہیں کیے جاسکتے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ہمیں اس بات کو ترجیح اور اہمیت دینی چاہیے کہ ملک میں آخر کس نوعیت اور کس مقصد کے لیے تعمیرات کی جارہی ہیں؟

کاظم سعید: آپ کا سوال بالکل درست اور بجا ہے۔ ہمیں واقعی یہ گہرائی سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کس چیز کی تعمیرات کر رہے ہیں۔ جہاں تک رہائشی شعبے کا تعلق ہے تو عام پاکستانیوں کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر سستے گھروں کی ہاؤسنگ اسکیمز کی شدید ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے بہت سے ممالک میں ایک باقاعدہ اور منظم مارگیج سسٹم (Mortgage Scheme) موجود ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومتیں یا بینک 30 سال کی طویل مدتی ضمانت پر نوکری پیشہ اور کم آمدنی والے افراد کو آسان اقساط پر گھروں کی تعمیر کے لیے قرض فراہم کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ یہ نہ سوچیں کہ رہائشی اسکیموں کی تعمیرات سے صرف عارضی بنیادوں پر ہی روزگار پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی سند یافتہ اور ہنرمند پلمبر، الیکٹریشن، کارپینٹر یا راج مستری کسی گھر کی تعمیر کے دوران اچھا کام کرتا ہے تو بعد میں بھی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے لوگ بار بار اسی ہنرمند سے رابطہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی تکنیکی و ووکیشنل جابز غربت کے خاتمے کے لیے پہلی بنیادی سیڑھی ثابت ہوتی ہیں کیونکہ لوگ اپنے ذاتی ہنر اور کوالٹی کی بنیاد پر مسلسل پیسہ کماتے ہیں۔ اگر لوگوں کے پاس تکنیکی مہارت نہیں ہوگی تو ظاہر ہے وہ درست کام نہیں کر سکیں گے۔ اسی لیے اب لوگ سرٹیفائیڈ اور تربیت یافتہ کاریگروں سے کام کروانا پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا خامیاں اپنی جگہ ہے لیکن آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ تعمیراتی سرگرمیوں سے معیشت کے نچلے طبقے کو فوری اور وسیع پیمانے پر روزگار کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اظہر جمیل (کنسرن سٹیزن الائنس): میرے ایک بائیں بازو کے دیرینہ

دوست معراج صاحب نے اپنی پوری زندگی سیاست میں گزاری۔وہ اکثر مزاحاً مگر بہت سچی بات کہا کرتے تھے کہ اس سرکاری بجٹ میں رکھا ہی کیا ہے؟ جتنا بھی ٹیکس جمع ہوگا وہ سب سے پہلے قرضوں کی ادائیگی اور سود (Debt Servicing) میں چلا جائے گا۔بجٹ کا ایک اور بڑا حصہ سول انتظامیہ اور پولیس وسیکیورٹی پر خرچ ہو جائے گا، کچھ حصہ حکومت کے اپنے شاہانہ اخراجات میں نکل جائے گا اور اگر غلطی سے کچھ رقم بچ گئی تو اس سے برائے نام ترقیاتی کام (ADP) کر لیے جائیں گے۔اور اگر ٹیکس کی وصولی سے کچھ نہ بچا تو ہم مزید آئی ایم ایف (IMF) کے پاس قرضہ لینے چلے جائیں گے۔یعنی اتنے بڑے اور تجربہ کار سیاست دان نے ہماری پوری حکومتی پالیسی اور بجٹ کی اصلیت کو ایک جملے میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ہم لوگ سالہا سال سے اتنے بڑے بڑے سیمینارز اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں لیکن آج تک ہم بنیادی معاشی مسائل کا کوئی عملی حل تلاش نہیں کر سکے۔اسی لیے آج ہمارے ملک کی یہ حالت ہو چکی ہے۔

میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ اگر حکومت میں اتنی بے تحاشا فضول خرچیاں اور غیر پیداواری اخراجات ہو رہے ہیں تو ان کو عملی طور پر کیسے کم کیا جائے؟ اور دوسری بات یہ کہ اس ملک میں جو بااثر طبقات کھلم کھلا ٹیکس چوری کرتے ہیں خواہ وہ شوگر ملز کے مالکان، کھاد فیکٹریوں کے مالکان، یا رئیل اسٹیٹ اور تعمیراتی کاموں سے منسلک بڑے سرمایہ کار ہوں، ان کے پاس بے تحاشا پیسہ تو موجود ہے لیکن ان پر باقاعدہ ٹیکس نہیں لگایا جاتا۔ ان تمام بااثر لوگوں سے بلاتفریق پورا ٹیکس وصول کیا جائے تو ہمارے پاس ابھی جتنا کل ٹیکس جمع ہوتا ہے یہ با آسانی اس سے دگنا ہو سکتا ہے۔اور جب ریاست اتنی بڑی

مقدار میں ٹیکس حاصل کر لے گی تو ہم پرانے قرضوں اور آئی ایم ایف کے سخت پروگراموں سے با آسانی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔آپ اس پر کیا کہتے ہیں؟

مجید موٹانی (صدر پاکستان فشر فوک فورم): میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں قائم طبقاتی نظام نے سب سے زیادہ تباہی اور نقصان پہنچایا ہے۔ہم بچشمِ خود دیکھتے ہیں کہ غریب کے بچے کو تعلیم اور ترقی کی وہ سہولیات اور ماحول کبھی میسر نہیں آتا جو امیر کے بچے کو ملتا ہے۔امیروں کے لیے آغا خان، بیکنز فیلڈ اور اس جیسے دیگر بین الاقوامی اور مہنگے ترین اسکول موجود ہیں جبکہ دوسری طرف سرکاری اسکولوں یا محلے کے چھوٹے نجی اسکولوں میں تعلیم کا معیار انتہائی زوال پذیر ہے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک کسی اسمبلی کا رکن (MPA) اور عام کسان یا مزدور کا بچہ ایک ہی اسکول میں ایک ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل نہیں کریں گے تب تک یہ ملک کبھی حقیقی ترقی نہیں کر سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بین الاقوامی حالات اور امریکہ و ایران کشیدگی یا جنگی اثرات کے باعث جب بھی عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے تو اس کا سب سے پہلا اور براہِ راست اثر ہمارے عام لوگوں پر پڑتا ہے۔اگر میں ماہی گیری کے حوالے سے بات کروں تو سمندری کشتیوں میں سب سے زیادہ ڈیزل استعمال ہوتا ہے۔ایک سمندری کشتی روڈ پر چلنے والی گاڑی کے مقابلے میں 10 گنا زیادہ ڈیزل جلاتی ہے۔اس کی بنیادی تکنیکی وجہ یہ ہے کہ کشتی کو پانی کی لہروں کو کاٹ کر اور خود کو زبردستی کھینچ کر آگے چلانا پڑتا ہے جس سے ایندھن کا خرچ بے تحاشا بڑھ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حکومت جب بھی ڈیزل کی قیمتیں بڑھاتی ہے تو سب سے زیادہ معاشی بوجھ

اور مار ہمارے غریب ماہی گیروں پر پڑتی ہے۔

تیسری اور انتہائی تشویشناک بات یہ ہے کہ ہمارے شہر کراچی کی بنیادی ندیاں (ملیر ندی، لیاری ندی اور حب ندی) شہر بھر کے گندے نالوں اور زہریلے کیمیکلز سے بھر چکی ہیں۔ جب یہ تمام زہریلا پانی اور سیوریج لائنز بنا کسی ٹریٹمنٹ براہِ راست سمندر میں جا کر گرتی ہیں اور وہی آلودہ پانی سمندری حیات اور مچھلیوں کے پیٹ میں جاتا ہے تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم کس قسم کی خوراک کھا رہے ہیں۔ اگر ہماری چائے کے کپ میں ایک چھوٹی سی مکھی بھی گر جائے تو ہم نفاست پسندی دکھاتے ہوئے پوری چائے پھینک دیتے ہیں لیکن جب زہریلے اور کیمیائی مادے مچھلیوں کے پیٹ کے ذریعے ہمارے دسترخوان تک پہنچ رہے ہیں تو ہم اسے بڑی خوشی سے کھا رہے ہیں۔ اس ماحولیاتی اور غذائی تباہی پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

زاہد فاروق: آپ کا بہت شکریہ مجید صاحب کہ آپ نے اس سیمینار میں شرکت کی اور اتنے اہم اور تلخ مسائل پر بات کی۔ آپ کا تعلق شہرِ کراچی کی اس قدیم اور اصل باسی کمیونٹی (ساحلی برادری) سے ہے جو کراچی کی آبادی کے ابتدائی دور سے یہاں آباد ہے۔ بلاشبہ آپ لوگوں کے بے شمار ایسے سنگین مسائل ہیں جن پر الگ سے اور تفصیلی بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ہم بہت جلد ہم یوآرسی میں ایک مکمل اور خصوصی فورم منعقد کریں گے تاکہ ماہی گیروں کے تمام مسائل، معاشی مظالم اور آلودگی کے موضوع کو اجاگر کر کے حکامِ بالا تک آپ کی مؤثر آواز پہنچائی جا سکے۔ بہت شکریہ

مہمان: کراچی کے مسائل کس طرح حل ہوں گے؟ کیونکہ اس وقت کراچی کے شہریوں کے لیے سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ پانی کا بحران (Water Crisis) ہے۔

کاظم سعید ابھی اظہر صاحب نے سوال کیا تھا کہ ہم مزید کس طرح ٹیکس جمع کر سکتے ہیں؟ اس حوالے سے ایک تکنیکی اور عملی جواب یہ ہے کہ ایف بی آر (FBR) نے شوگر ملوں میں ٹریک اینڈ ٹریس سسٹم کے تحت کیمرے تو لگا دیے ہیں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟ (یعنی بااثر مالکان سے ٹیکس کی عملداری کون کروائے گا)؟ میرے خیال میں ٹیکس کی حقیقی وصولی صرف بجٹ کی دستاویز سے آگے کا ایک سیاسی و انتظامی سوال ہے۔

جہاں تک کسانوں پر لگائے گئے ایگریکلچر ٹیکس کا تعلق ہے تو عام طور پر میڈیا اور اینکرز اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ملک کی جی ڈی پی (GDP) میں 50 فیصد حصہ سروسز سیکٹر کا ہے لیکن اس سے 50 فیصد ٹیکس جمع نہیں ہوتا۔ جبکہ جی ڈی پی میں 25 فیصد حصہ زراعت کا ہے تو اس سے لازماً 25 فیصد ٹیکس آنا چاہیے۔ اسی منطق کے تحت آئی ایم ایف (IMF) کی طرف سے بھی سخت ہدایات جاری کی گئیں کہ زراعت کے شعبے پر انکم ٹیکس لاگو ہونا چاہیے۔ جس پر تمام صوبائی حکومتوں نے پچھلے سال اپنے اپنے ایگریکلچرل انکم ٹیکس کے قوانین پاس کر دیے اور کسانوں پر بھی تنخواہ دار طبقے کی طرز پر ٹیکس سلیب لاگو کر دیے۔ حالانکہ ایک عام کسان پر اس طرح ٹیکس کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ وہ بطور بزنس کارپوریشن نہیں بلکہ ایک محدود کاروبار کے طور پر زراعت کرتا

ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب کچھ بڑے معاشی ماہرین ٹی وی پر بیٹھ کر دعوے کرتے ہیں کہ اس تخمینے سے 800 ارب روپے کسانوں سے وصول کیسے جا سکتے ہیں۔ میرے تجزیئے کے مطابق 300 سے 400 ارب روپے بھی بمشکل ہی وصول ہو سکیں گے کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ پاکستان کے 95 فیصد کسانوں کی سالانہ آمدنی 6 لاکھ روپے سے بھی کم ہے۔

میں نے آپ کے سوال کا جواب اس طرح دے دیا ہے کہ ہمیں کہاں سے ٹیکس نہیں مل سکتا۔ زراعت کے بنیادی شعبے میں کسانوں کو کوئی خاص منافع حاصل نہیں ہوتا بلکہ اصل بے تحاشا منافع اس درمیانی سرمایہ دار (Arhti) اور مڈل مین کو ہوتا ہے جو کسان سے سستے داموں اجناس خرید کر ذخیرہ کر لیتا ہے۔ ان بڑے مڈل مینوں اور ہول سیل سرمایہ داروں سے ٹیکس وصول کیا جانا چاہیے۔ پچھلے سال ہی کی مثال دیکھ لیں، گندم کی فصل کے سیزن میں ٹیکسٹائل ملز اور تعمیراتی سیکٹر سے تعلق رکھنے والے بڑے سرمایہ داروں نے گندم کے کاروبار میں پیسہ لگا کر غیر معمولی منافع کمایا۔ مئی میں جب کسان سے گندم خریدی گئی تو قیمت 2,200 روپے فی من تھی، اور صرف تین مہینوں کے اندر ہی گندم مارکیٹ میں 4,500 روپے فی من تک پہنچ گئی۔ یعنی جس کے پاس فالتو سرمایہ تھا اس نے گندم خرید کر اسٹاک کر لی اور جب مارکیٹ میں مصنوعی قلت یا قیمت بڑھی تو اربوں روپے کا منافع کما لیا۔ تکلیف صرف کسان اور عام صارف نے بھگتی۔

اس کے علاوہ بجٹ میں کراچی کے لیے کیا رکھا گیا ہے اور کراچی کے انفراسٹرکچر

یا پانی کے مسائل کے بارے میں کوئی کیوں نہیں سوچتا، یہ دو الگ مگر گہرے موضوعات ہیں۔ اگر ہم بڑے پیمانے پر دیکھیں تو معیشت اور سیاسی معیشت کا جتنی گہرائی سے میں نے مطالعہ کیا ہے، ہماری حکومتیں یہی سمجھتی ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی عارضی سبسڈی، ٹریکٹر اسکیم یا کچھ فنڈز دے دیے تو بس ان کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ ہم بجٹ سازی کے اس روایتی اور ناکام فریم ورک سے کیسے باہر نکلیں گے؟ یہ ایک طویل بحث ہے۔ پچھلے 200 برسوں کی سیاسی و معاشی ترقی کے تناظر میں ہم کسی دن الگ سے تفصیلی گفتگو کر سکتے ہیں۔ آپ تمام ساتھیوں کا بہت شکریہ۔

زاہد فاروق: بہت شکریہ کاظم سعید صاحب! آپ نے انتہائی مدلل، سادہ اور علمی انداز میں تمام حاضرین و شرکاء کے سوالات کے جوابات دیے اور معاشی باریکیوں کو واضح کیا۔ اب میں دعوت دیتا ہوں ہمارے آج کے معزز مہمان اور بین الاقوامی ماہرِ تعمیرات و پلانر جناب عارف حسن صاحب کو کہ وہ تشریف لائیں اور موضوع کے حوالے سے اپنے اختتامی خیالات و تجاویز پیش فرمائیں۔

عارف حسن (چیئرمین۔ یوآرسی): آپ کا بہت شکریہ کاظم صاحب! آپ نے بہت سی چیزیں، خصوصاً معاشی اعداد و شمار، انتہائی فہم اور اچھے انداز میں سمجھائے۔ تاہم معیشت میں ایک بنیادی چیز ہوتی ہے جسے نظریہ (Ideology/Theory) کہتے ہیں۔ یہی نظریہ دراصل یہ فیصلہ کرتا ہے کہ آپ کی حکومت، ریاست کا فریم ورک، اور معاشرتی و طبقاتی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی واضح نظریاتی سمت ہی نہیں ہوتی اور ایسے میں جس کے بازو میں زیادہ

طاقت ہوتی ہے وہی معاملات اور وسائل پر قابو پالیتا ہے۔آپ نے اپنی گفتگو میں نظریے کے حوالے سے کھل کر بات نہیں کی، جس کا ذکر آپ نے اپنی کتاب میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔

ہم نے کئی سال پہلے ایک معلوماتی مشق کی تھی جس میں ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ایک غریب انسان غربت کے بارے میں کیا سوچتا ہے اور وہ اسے کس طرح بیان کرتا ہے۔تقریباً 650 ایسے افراد جن کے پاس نہ اپنے مکان تھے اور نہ کوئی مستقل ملازمت تھی۔جب ہم نے ان سے بات چیت کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ ان عام لوگوں کے لیے اپنی چھت (Housing Security) سب سے زیادہ بنیادی ضرورت تھی۔جب ہم نے ان سے پوچھا کہ اپنی چھت کیوں ہونی چاہیے؟ تو انہوں نے بتایا کہ:

- اس سے ہر ماہ پیسے بچتے ہیں اور کرائے کا مستقل بوجھ ختم ہوتا ہے۔
- اپنی چھت ہو تو معاشرے اور برادری میں عزت و وقار ملتا ہے۔
- بچوں، خصوصاً لڑکیوں کے لیے رشتے بہتر اور آسانی سے آتے ہیں۔

غرض ایک طویل تفصیل تھی، مگر وہ تمام 11 بنیادی موضوعات جو انہوں نے بیان کیے، وہ سب کے سب ایک محفوظ چھت کے گرد گھومتے تھے۔

مکان کے علاوہ تعلیم دوسرا سب سے بڑا مسئلہ تھی۔تعلیم کے حوالے سے کاظم صاحب نے جو ذکر کیا وہ بالکل درست ہے۔تعلیم کے حصول میں ٹرانسپورٹ کے اخراجات ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔بچے کسی نہ کسی طرح پرائمری تک تعلیم مکمل کر لیتے ہیں لیکن

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا حصول غریب خاندانوں، خصوصاً لڑکیوں کے لیے ایک بڑا معرکہ بن جاتا ہے۔ مہنگی فیسیں اور اسکول و کالج کا فاصلہ تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی دیوار ہے۔ ہمارے ڈیٹا کے مطابق 620 میں سے 450 گھرانوں کو یہ دردناک فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ اپنے کسی ایک بچے یا بچی کو تعلیم دلوائیں کیونکہ والدین کی مالی استطاعت صرف ایک بچے کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کی تھی۔ اس مجبوری کی وجہ سے گھروں کے اندر شدید تناؤ اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور جس بچے کے خلاف پڑھائی نہ دلوانے کا فیصلہ ہوتا ہے وہ اکثر دلبرداشتہ ہو کر موقع ملتے ہی گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

یہ معاشی اور سماجی حقائق انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان جذباتی و انسانی مسائل کو صرف بجٹ کے اعداد و شمار سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں صرف ایک انسانی اور انقلابی نظریے کی بنیاد پر ہی سمجھا اور حل کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں پچھلی چند دہائیوں میں ایک بہت بڑا سماجی انقلاب آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار خواتین بڑی تعداد میں گھروں سے باہر نکل کر معاشی جدوجہد اور ملازمتیں کر رہی ہیں۔ اگرچہ ان کے کام کے جگہوں پر مسائل تاحال حل نہیں ہوئے لیکن یہ ایک بہت بڑا بنیادی قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ سے روایتی توسیعی خاندانی نظام اب نیوکلیئر فیملی میں تبدیل ہو کر بہت حد تک ختم ہو رہا ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں نے ابتدا میں پیپلز ہاؤسنگ سوسائٹی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تھا اور ہم کچی آبادیوں میں جاتے تھے تو گلیوں میں کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ نہ فیکٹریوں میں خواتین کام کرتی تھیں اور نہ ہی گھروں میں معاشی مدد کے لیے جاتی

تھیں۔ مردوں میں بھی قیادت تمام تر عمر رسیدہ اور روایتی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔لیکن اب ہمارے معاشرے کے اندر بے حد گہری اور ساختاتی تبدیلی آچکی ہے اور یہ تبدیلی ہم اپنے گھروں اور محلے میں بھی محسوس کرتے ہیں۔

میرا سوال یہ ہے کہ یہ سماجی تبدیلی ہمارے حکومتی اور معاشی نظریے میں کہاں فٹ ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو ہمیں اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ہماری پالیسیوں میں اس کی کوئی جگہ نہیں تو پھر ہمارے معاشرتی مسائل کی خامیوں کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ معاشرے کی اس تبدیلی اور مسائل کو سمجھنے کے لیے تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔کوئی بھی قومی پالیسی بنانے سے پہلے زمینی حقائق کی تحقیق لازمی ہونی چاہیے۔لیکن جب ریاست کا نظریہ ہی یہ ہو کہ ہم نے تحقیق نہیں کرنی اور اگر کی بھی تو صرف اسی پرانے مفاد پرست نظام کو پروان چڑھانے کے لیے کرنی ہے تو آپ کے تمام تعلیمی وتحقیقی ادارے بیکار ہو جاتے ہیں۔اور جب تعلیمی ادارے تحقیق چھوڑ دیں، تو وہاں سے پھر بے تحاشہ مسائل جنم لیتے ہیں۔

زاہد فاروق: میں عارف حسن صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے تعلیمی اداروں میں حقیقی تحقیق اور سماجی تبدیلی کے موضوع پر اتنی فکر انگیز گفتگو کی۔آج کا طالب علم اپنے استاد یا ریاست سے کیا اور کیوں؟ جیسے سوالات کیوں نہیں کرتا؟ اس رویے کو بدلنے کے لیے بھی ہمیں تعلیمی اداروں میں گفتگو کرنے اور تحقیق کی روایت کو زندہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے موجودہ دور کے ان معاشی وسماجی مسائل پر ہر علاقے، سیاسی پارٹیوں، ایوانوں، اور تعلیمی اداروں میں مسلسل بحث ہونی

چاہیے۔

عارف حسن: میں آپ کو بتا تا چلوں کہ تعلیمی اداروں میں یہ تبدیلی اتنی جلدی نہیں آئے گی، اس میں ابھی کافی وقت لگے گا۔ جب اداروں میں تحقیق کی حقیقی اہمیت پر بات شروع ہوگی تو اس کے اثرات ایک پوری نسل کے بعد جا کر گفتگو اور معاشرے میں عام ہوں گے۔

زاہد فاروق: جی بالکل! لیکن جس طرح آج اربن ریسورس سینٹر میں بجٹ اور معیشت کے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی، ہم دیگر تمام تنظیموں اور سول سوسائٹی کے اداروں کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ مختلف جگہوں پر اسی طرح کی فکری نشستیں منعقد کروائیں۔ کیونکہ جب گفتگو کا آغاز ہوتا ہے تبھی بات آگے بڑھتی ہے اور متعلقہ اداروں و اربابِ اختیار تک عوام کی آواز پہنچتی ہے۔ کچھ مسائل کسی ایک مخصوص کمیونٹی، فقہ یا مذہب کے ہو سکتے ہیں لیکن آج ہم نے جن موضوعات پر بات کی، چاہے وہ مہنگائی ہو، تعلیم، چھت، یا روزگار ہو۔ یہ ہم سب کے مشترکہ اور عوامی مسائل ہیں۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ مشترکہ مسائل کے حل کے لیے مشترکہ جدوجہد اور گفتگو ہونی چاہیے تاکہ یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا رہے۔ آپ تمام معزز مہمانوں، مقررین اور شرکاء کا بہت شکریہ۔

☆-------------☆-------------☆

جون 2026

عالمی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی
ایک فکری جائزہ

مقررین: حارث گردیزی، عارف حسن

اربن ریسورس سینٹر

F-144-67

مئی 2026

ٹریفک کے نئے قوانین
اور عملدرآمد کا طریقہ کار

مقررین: سید یحییٰ محمد شاہ، عارف حسن

اربن ریسورس سینٹر

F-144-65

مئی 2026

شہری منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدامات
ایک جائزہ

مقررین: نعیم احمد صادق، عارف حسن

اربن ریسورس سینٹر

F-144-66

یو آر سی فورم سیریز

یو آر سی ملکی اور بین الاقوامی ترقیاتی منصوبوں کے مسائل پر کام کرنے والے ممتاز ماہرین کے لیکچرز کا اہتمام کرتا ہے جن کے بنیادی سطح پر مسائل کے حل پر کام کرنے والے کارکنان، این جی اوز کے نمائندے سرکاری اداروں سے وابستہ اہلکار میڈیا اور تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد اور متعلقہ لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یہ فورم تنظیمی اور انفرادی سطح پر کام کرنے والوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے کام کا وسیع قومی اور بین الاقوامی معاملات سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ یہ لیکچر ان تحریکوں کے لئے کام کرنے والوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں جو پاکستان اور خصوصی طور پر کراچی میں منصفانہ اور ایسی حکمت عملیوں کے وضع کرنے کے لئے چلائی جا رہی ہیں جن کا مقصد صرف عوامی ترقی ہو۔

" حالیہ بجٹ: عوام دوست یا معاشی بوجھ۔۔۔ایک فکری جائزہ "

کے عنوان سے یہ فورم 18 جون 2026ء کو یو آر سی میں منعقد ہوا۔